اداریہ

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

گذشتہ نصف صدی میں ہم نے اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں جو رویہ اختیار کیا، اس پر نہ صرف اہلِ دانش بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بلکہ سرکاری رپورٹوں میں بھی اس بات کا کھل کر اعتراف کیا گیا ہے کہ ہم نے اپنی اجتماعی زندگی میں جو روش اختیار کی ہے، اس سے ہمیں بربادی اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ لیکن ہم ہیں کہ اپنی پرانی روش کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں؟

یوں نظر آتا ہے کہ دنیا ہمیں لاکھ بے ایمان کہے، شوق سے کہے۔ لیکن ہمارا جواب یہی ہے، کہ 'جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟' بے شبہ دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں کرپشن پائی جاتی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج جن ملکوں میں سب سے کم کرپشن پائی جاتی ہے، مثلاً سنگاپور، نیوزی لینڈ، فن لینڈ، سویڈن یہ سب غیر مسلم ریاستیں ہیں، لیکن ہم ان سے بھی سبق لینے کے لیے تیار نہیں۔

چنانچہ سیاسی زندگی میں منفی، جذباتی اور غیر اخلاقی رویے سے ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور ناکام ریاست یا ناکام اُمیدوں[1] کی آوازیں اُٹھیں۔ لیکن ہم ہیں کہ سچائی سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے تیار نہیں یا یوں کہیے کہ سچائی کا برابر انکار کرتے کرتے ہم اس مقام تک جا

---

[1] چند سال پہلے مرحوم حفیظ کاردار نے اپنی کتاب (لاہور ۱۹۹۵ء) Failed Expectations عنایت کی۔ اس کتاب میں انہوں نے بڑے دکھ سے تعلیم و تربیت کے بارے میں ہماری ناکامیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ شاید پہلی کتاب ہے جس میں ایک پاکستانی اہلِ علم نے مرحوم ڈاکٹر فضل الرحمٰن پر لکھا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے خود مجھ سے کہا تھا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ان کی اعلیٰ تعلیم حفیظ کاردار کی رہینِ منت ہے۔ جب خاکسار نے کاردار صاحب کو یہ بتایا تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا کہ انہیں فخر ہے کہ انہوں نے جس غریب طالب علم کی مدد کی تھی، وہ آگے چل کر بڑا اسکالر بنا۔

پہونچے ہیں جہاں پر کوئی نصیحت، ضمیر کی کوئی آواز ہمیں سنائی نہیں دیتی۔ اس لیے کہ بلند بانگ دعوے اور کھوکھلے نعرے ہمارے اور ہمارے ضمیر کے درمیان حجاب بن گئے ہیں۔ اب ضمیر کی آواز سنیں تو کیوں کر؟ چنانچہ آج تک ہم کوئی ایسا دستور نہ بنا سکے جس کے تحت ہم ایک نظم ونسق اور قرینے سے اپنی سیاسی زندگی بسر کرتے۔ ہمارا پہلا دستور قیامِ پاکستان کے ۹ سال بعد ۱۹۵۶ء میں تیار ہوا۔ جب مشرقی اور مغربی پاکستان میں بدگمانیاں جنم لے چکی تھیں، مغربی پاکستان میں مذہبی مظاہروں کو تشدد کی راہ پر لگا دیا گیا تھا۔ پھر وہی ہوا جو برصغیر میں مظاہروں کی روایت ہے۔ وہی توڑ پھوڑ، وہی خون ریزی جو مظاہروں کا امتیازی نشان ہے[1]۔ ۱۹۵۳ء کے خوف ناک فسادات پر منیر رپورٹ نے ہماری فکری، سیاسی اور مذہبی ژولیدگی کو واضح کر دیا۔ افسوس! یہ پہلا دستور صرف دو سال قابلِ عمل رہا۔ ۱۹۵۸ء میں پہلی مارشل لاء حکومت نے اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اس کی جگہ اپنا دستور دیا۔ جسے ۱۹۶۹ء میں ایک دوسری فوجی حکومت نے چاک کر ڈالا اور نئے انتخابات کرائے۔ لیکن ان کے نتائج کو نہ صرف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ مشرقی پاکستان پر دھاوا بھی بول دیا، جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان نے ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی صورت میں جنم لیا۔ لیکن یہ المیہ بھی ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار نہ کر سکا۔ اس حادثے کے بعد اسلام آباد میں پھر دستور (۱۹۷۳ء) تیار کیا گیا جس پر حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف دونوں نے دستخط کیے۔ لیکن اس کی سیاہی ابھی خشک نہ ہوئی تھی کہ 'سول مارشل لاء' آ گیا جس نے سیاسی زندگی کو سرِ بازار رسوا کیا۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ہم سیاسی زندگی میں برابر بدعنوانیاں کرتے چلے گئے۔ لیکن بانیٔ پاکستان اور علامہ اقبال کا نام ہمیشہ وردِ زبان رہا۔

۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کی یہ 'سیاسی کامیابی' تھی کہ ملک کی سیاسی اور خاص طور پر مذہبی جماعتیں اپنے دعوؤں کو بھول بھال کر مارشل لاء کے سایہ تلے حکومت بنانے کے لیے تیار

[1] یہاں اس بات کا ذکر شاید بے جا نہ ہوگا کہ مرحوم ابوالکلام آزاد نے ۱۹۵۳ء میں اس الم ناک صورتِ حال پر پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد کو لکھا: ''ایجی ٹیشن نے بتا دیا کہ فینا ٹی سیزم (Fanaticism) کی باگ ڈور ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو اس کے تباہ کرنے والے نتائج کہاں تک پہونچ سکتے ہیں۔'' (ابوالکلام آزاد اور جدید ہندوستان، از سید اکبر علی ترمذی، دہلی (۱۹۹۰ء)، ص ۱۹

ہوگئیں لیکن لیلائے وزارت کے ساتھ لطف اندوزی کی یہ شبِ وصال جلد ہی ڈھل گئی اور صبح دم پتہ چلا کہ 'بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا'۔ البتہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء حکومت کے آستانے پر اگر کسی سیاسی جماعت نے سجدہ نہیں کیا تو وہ وہی جماعت تھی، جو پرامن جدوجہد اور جمہوریت پر یقین رکھتی تھی، لیکن پیشہ ور مذہبی جماعتوں کی نگاہ میں وہ سیکولر تھی:

کچھ ہوئے تو یہی رنداں قدح خوار ہوئے

تیسرے مارشل لاء کے خاتمے پر جو سیاسی جماعتیں اقتدار میں آئیں، انہوں نے بیسویں صدی کے آخری عشرے میں جس سیاسی اور اخلاقی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا، اس سے ہماری سیاست، معیشت اور انتظامیہ کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل گیا اور ملک سر سے پا تک غیر ملکی قرضوں اور اخلاقی فساد (Corruption) میں ڈوب گیا۔ اس دور کی بدعنوانیوں کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ لندن میں پاکستان کے ایک سابق ہائی کمشنر مسٹر شہریار نے ایک بیان میں کہا: ''افسوس ہے کہ گزشتہ پچاس سال میں ملک کئی اعتبار سے خواندگی، تعلیم اور (بلند) قدروں کے میدان میں پیچھے رہا... ہمارا فرض ہے کہ پھر سے (اپنی اجتماعی زندگی) کا آغاز کریں۔ ہمارے زوال کی ایک بنیادی وجہ ریاستی فساد (State Corruption) ہے۔ جو آج ہمارا طرزِ زندگی ہے۔''

جناب شہر یار خانصاحب نے سرکاری سطح پر قومی دولت کے ضیاع پر کہا: ''۱۹۹۵ء میں جب اوک لینڈ (New Zealand) میں دولتِ مشترکہ کا اجلاس ہوا تو پاکستانی وفد تہتر (۷۳) افراد پر مشتمل تھا۔ حالانکہ اجلاس میں ہر ملک کے صرف پانچ آدمیوں کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اسی طرح اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں پاکستانی وفد میں ایک سو تین (۱۰۳) آدمی شریک تھے۔ حالانکہ کہ اس سے پہلے پاکستانی وفد میں ۱۴ سے زیادہ آدمی نہیں ہوتے تھے۔'' یہاں سوال صرف یہ ہے کہ جب دوسرے ملک (اپنی قومی دولت) کا ضیاع نہیں کرتے، آخر ہم ایسا کیوں کرتے ہیں[۱]؟''

---

[۱] ڈان، ۲۳/جون ۱۹۹۶ء، ص ۳۔

یہاں اپنی سیاسی اور اخلاقی زندگی کی ناکامیوں کا تذکرہ کرنے سے مقصد یہ ہے کہ کیا ابھی تک وقت نہیں آیا کہ ہم آئینۂ روزگار میں اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ ہمیں یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ بھارت اور پاکستان ایک ہی وقت میں آزاد ہوئے تھے۔ بھارت نے ۱۹۴۹ء میں جس دستور کو تیار کیا، وہ آج تک دہلی میں حکمران ہے اور بری بھلی جمہوری حکومت برابر کام کر رہی ہے۔ اس دستور میں کہا گیا ہے کہ ملک میں تعلیم عام ہوگی۔۲۔ یہاں جاگیرداری یا زمینداری کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک دہلی میں پرامن طریق سے دستوری حکومت بدلتی رہی ہے۔ کسی صدر ریاست یا صدرِ حکومت کو بزور ہٹایا نہیں گیا۔ حتیٰ کہ نئی دہلی نے کلکتہ میں مسٹر باسو کو گوارا کیا جو ۲۳ر سال تک مغربی بنگال میں کمیونسٹ حکومت کے وزیرِ اعلیٰ رہے۔ اس کے برعکس یہاں ہم تین بار دستور کو غرقِ سمندر کر چکے ہیں اور تقریباً ہر صدرِ ریاست اور وزیراعظم کو بزورِ حکومت سے الگ کیا گیا ہے۔ جہاں تک تعلیم و تربیت کا تعلق ہے۔ ادھر چند سال قبل عالمی رپورٹوں میں کہا گیا تھا کہ بھوٹان اور افغانستان کو چھوڑ کر پاکستان قوموں کی برادری میں سب سے پیچھے کھڑا ہے۔

۲۔ اس نصف صدی میں خاص طور پر ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۹ء تک بعض مذہبی اور سیاسی ممبر سینٹ یا قومی اسمبلی میں شریعت بل یا شریعت ایکٹ پیش کر چکے ہیں۔ چشمِ فلک نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ جو حکومت شریعت بل پیش کر رہی تھی، وہی حکومت انتہائی غیر ذمہ داری سے قومی خزانہ کو لوٹ بھی رہی تھی۔ رشوت، سفارش اور اقربا پروری کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ بے رحمی سے عدل و انصاف، مخلوقِ خدا کے وقار اور قانون و اخلاق کو پاؤں تلے روندے۔ کیا یہ طرزِ زندگی نفاق و دجل کے دائرے سے باہر ہے؟

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے؟ غالب!
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

ایک من چلے نے ٹھیک کہا تھا کہ جب سے اسلامی نظام کا نعرہ لگایا گیا ہے۔ نظام اور اسلام دونوں ہی اپنے وطن میں غریب الوطن ہیں۔ شریعت ایک مقدس قانون ہے جو سچائی، عدل و

انصاف اور مخلوقِ خدا کی خدمت کی علامت ہے لیکن آج ہماری سوسائٹی میں سیاست اور مذہبی و لسانی فرقہ واریت کے ہاتھوں انسان نے انسان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، کیا شریعتِ مقدسہ اور اخلاقی قدروں کو جان و دل سے عزیز رکھنے والے گناہ کی اس پستی میں اتر سکتے ہیں۔ ابراہیم بن ادہم دُعا مانگا کرتے تھے: **اللھم! ارفعنی من ذل المعصیه الی عزّ الطاعة** ''خدایا! مجھے گناہ کی ذلت سے اُٹھا کر (مقامِ) طاعت کی عزت سے نواز۔''

ایک وقت تھا، جب اہلِ نظر کی ایک جماعت یہ رائے رکھتی تھی کہ دنیا میں دو عالمی فلسفہ ہائے حیات، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے زوال سے جو خلا پیدا ہو گا، اسے اسلام پر کرے گا، جو زندگی کے بارے میں ایک صحتمند اور مثبت نظریہ رکھتا ہے، لیکن افسوس! مسلم دنیا کی حالیہ فکری اور سیاسی تاریخ نے ہمیں بتایا کہ مسلم دنیا ابھی تک اس تاریخی رول کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ پاکستان انڈونیشیا اور خاص طور پر عرب دنیا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

بیسویں صدی تاریخ کا حصہ بن رہی تھی، پاکستان میں چوتھی بار پھر اکتوبر ۱۹۹۹ء میں سیاسی حالات نے فوجی حکومت کو سامنے لا کھڑا کیا۔ نئی فوجی حکومت نے اپنے ایجنڈے میں جن مسائل کو بنیادی قرار دیا ہے، وہ ہیں: بدعنواں عناصر کا محاسبہ، معیشت کی بحالی اور بھارت سے اختلافی مسائل پر باہمی مذاکرات۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ حکومت اپنے مقاصد کو حل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہے۔ البتہ جس راہ پر وہ چل رہی ہے، وہ یقیناً منزل تک جاتی ہے۔ بے شبہ ایک نئے ولولے، اخلاص اور استقامت کے ساتھ سیدھی راہ پر چلتے رہنا بذاتِ خود ایک کامیابی ہے۔ اس کامیابی کا سہرا پر تشدد سیاسی یا مذہبی نعروں یا مظاہروں پر نہیں بلکہ معنوی زندگی کی اصلاح، فکر و نظر کی صحیح تعلیم و تربیت اور جمہوری قدروں کے فروغ پر ہے۔ جس کی تلقین ہمارے دین نے بار بار کی ہے۔ لیکن جب دین بہ قول ژنگ ایک منظم ضابطہ بن جاتا ہے۔ اور علم الکلام کے سانچوں میں ڈھلتا ہے۔ تو وہ دین دین نہیں رہتا[1]، جو خدا کی خبر دیتا ہے۔ شاید یہی

---

[1] C. Jung and Teresa of Avila: Spiritual Pilgrims, (New Yark, 1982), p.79. "Codified and dogmatized forms of original religious experience tend to become rigid,... religion no longer points to the presence of God."

وجہ ہے کہ اقبال نے کہا ہے کہ ''قرآن کا بنیادی مقصد انسان میں خدا اور کائنات سے اس کے باہمی تعلقات کا گہرا شعور بیدار کرنا ہے۔'' یہی وہ پاکیزہ شعور اور معنوی انقلاب تھا جسے قرآن نے اہلِ مکہ کے روح و قلب میں بپا کیا تھا۔ اور یہی لوگ بعد میں تاریخ کے سٹیج پر ایک اخلاقی جماعت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے۔

مسٹر مراد ہوف مین (Murad Hafmann) کا جنہوں نے مرحوم محمد اسد کے حوالہ سے اس عالمی خلا کا ذکر کیا ہے[1]، خیال ہے کہ عہدِ حاضر میں یہ رول شاید جرمن قوم ہی کو ادا کرنا پڑے گا۔ مراد ہوف ترکی میں جرمنی کے سفیر تھے اور اب وہ شعوری طور پر مسلمان ہیں اور اسلام ہی سے سرشار ہو کر کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہی رائے مرحوم ہمایوں لوداں رکھتے تھے، جو ۱۹۶۵ء میں لندن میں افغانستان کے سفیر تھے۔

تمنا تھی کہ یہ کردار مسلم دنیا ادا کرے، لیکن سراب کا پیچھا کرنے والے کبھی آبِ حیات تک پہنچ نہیں پاتے۔ ہم نے اجتماعی زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن سنجیدگی سے اپنی ناکامی کے اسباب کا سراغ لگانے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔ کیوں کہ ہم اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر چل رہے ہیں۔ ہمارے زبانی دعوے اور تقریر کی شعلہ بیانیاں ہمارے ''حسنِ عمل'' کی ترجمان ہیں۔ وقت نے بار بار ہمیں متنبہ کیا، لیکن ہم نے برابر وقت کی پکار سننے سے انکار کر دیا۔

قرآن مجید نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے: ''کہہ دیجئے کیا ہم تمہیں بتائیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔'' (الکہف: ۱۰۴)

آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں ایسے ہی فریب خوردہ لوگوں کے بارے میں

---

[1] مراد صاحب نے 'Diary of a German Muslim' کے نام سے اپنی ڈائری شائع کی ہے، جس کا دیباچہ مرحوم محمد اسد نے لکھا ہے، جس میں انہوں نے اسلام کے بارے میں مراد صاحب کی گہری بصیرت کی تعریف کی ہے۔

فرمایا ہے: ''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ قیامت کے دن سب سے عزیز اور مجھ سے قریب تر لوگ کون ہوں گے؟ یہ وہ لوگ ہوں گے جو حسنِ اخلاق میں سب سے برتر اور نرم مزاج جو لوگوں سے پیار کرتے ہیں اور پیار کیے جاتے ہیں۔ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس دن سب سے ناپسندیدہ لوگ کون ہوں گے جو روزِ حشر مجھ سے بہت دور ہوں گے؟ باتونی (الثرثارون) اور مہمل گفتگو کرنے والے (المتفیھقون)۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔[1]

ع بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

رشید احمد (جالندھری)

[1] سنن ترمذی (کتاب البر) اور الکامل للمبرد، ج ۱، ص ۳۰۲ (مرصفی ایڈیشن، قاہرہ)